© rasailojaraid.com

مقالات ومضامین

قومی تناظر میں اہلِ قلم کا کردار

جاذب قریشی

اس موضوع پر سیکڑوں سال سے اظہار خیال کیا جارہا ہے، جس کے حوالے سے فکر وعمل کے ان گنت زاویے اور رویے وجود میں آتے رہے ہیں۔ اس سوال کا بنیادی تعلق تو انسان اور اُس کی ذمے داریوں سے ہے، لیکن ذمے داریوں کا شعور دینے والے اور مثبت انسانی روایات کو زندہ رکھنے والے تمام ادارے اس سوال یا اس موضوع سے جڑے ہوئے ہیں۔ اہلِ قلم کا اشارہ کرکے اس بات کو جاننے کی کوشش کی جاتی رہی ہے کہ کیا لکھنے پڑھنے والے، دوسرے لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں، تو اُن کے فکروعمل کے اظہار میں انسانی شعور وآگہی کی وہ کون سی صورتیں ہیں، جو اظہار پاکر قوموں، نسلوں اور معاشروں کو مثبت اقدار سے وابستہ رکھتی ہیں۔ اس حوالے سے شمیم احمد نے لکھا ہے کہ ”جب بھی میں نے ادیب کی ذمے داری پر گراں قدر مقالے اور تحریریں پڑھی ہیں تو مجھے یہی احساس ہوا کہ اس مسئلے پر لکھنے والے کی نظر میں ادیب انسان تو انسان آدمی بھی نہیں ہے، بلکہ ایک بندر یا گوریلا ہے، جس کو اُس کی ذمے داری کا احساس دلائے بغیر تہذیب وتمدن کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ کم ازکم ان تحریروں سے اتنا تو واضح طور معلوم ہوتا ہے کہ ادیب ایک غیر تربیت یافتہ اور نیم وحشی مخلوق ہے، جس کو زندگی، معاشرت اور تخلیقی عوامل کے اسرار و رموز بتانے ضروری ہیں۔“

اہلِ قلم کی اہمیت کے بارے میں بھی بہت سی باتیں کہی جاچکی ہیں کہ شعروادب کارِ پیغمبری ہے یا تخلیق کار رُوحوں اور ذہنوں کی تعمیر کرنے والے ہوتے ہیں۔

مذہبی کتابوں اور آسمانی صحیفوں کے بعد انسانیت کی سب سے بڑی اہمیت اور سب سے بڑی قوت اہلِ قلم ہی کو مانا گیا ہے، اس طرح زندگی اور کائنات کے ارتقا میں ہر مہذب عہد اور ہر متمدن دور کے درمیان وہی لوگ تاریخ کا حصہ رہے ہیں، جو مذہب، قانون، فلسفے، ادب اور سائنس کو پیش کرنے والے تھے۔

اہلِ قلم کا وجود پورے معاشرے اور پوری کائنات میں نئے سوال پیدا کرتا ہے۔ صاحب قلم اپنی قوم کا ایک جیتا جاگتا نمائندہ وجود ہوتا ہے۔ اُس کی خواہشیں، اُس کے خواب، اُس کی کمزوریاں وہی ہوتی ہیں، جو معاشرے کے دوسرے افراد کی ہوسکتی ہیں۔ البتہ اس میں ایک رنگ زیادہ ہوتا ہے کہ وہ چیزوں، واقعات، اجمالی محسوسات، معاشرتی طرزِ احساس اور رُوحِ عصر کو اپنے ذاتی جوہر کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ یہی انفرادی جوہر اُس کی تخلیقات میں ادبی اقدار کی تخلیق کرتا ہے۔ صاحب قلم کا انفرادی جوہر اُس کو ہمیشہ زندہ اور تروتازہ رکھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

تاریخی شعور کو اہلِ قلم ہی زندہ اور محرک رکھتے ہیں اور کسی قوم کے آدرش میں یا اُس کے آئیڈیل میں اہلِ قلم کا پیدا کردہ تاریخی شعور ہی موجود رہتا ہے۔ اہلِ قلم براہِ راست کوئی تحریک نہیں چلاتے، مگر نئے خواب اور تازہ خواہشیں تخلیق کرتے رہتے ہیں، جو زندہ قوموں کی کردار سازی کے حوالے سے اپنی تکمیل تک پہنچتی ہیں۔ اگر پچھلے ڈیڑھ سو برس کی ہندوستانی ادبی، سماجی اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سیاسی تاریخ کو دیکھا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ غالب، حالی اور سرسید سے اقبال تک اور پھر پاکستان کی تخلیق تک اہلِ قلم نے جو کچھ لکھا، اُس کے بیش تر حصے نے قومی کردار سازی کی تشکیل کا کارنامہ انجام دیا۔ اہلِ قلم نے افرنگیوں کی آمریت اور غلامی کو شکست دینے والا ذہن تعمیر کیا اور وہ رُوح پیدا کی، جو تحریکِ آزادی اور تخلیقِ پاکستان کا سبب بنی۔ اس منظرنامے میں چند ایسے بڑے رہنما بھی شریک رہے، جن کی ادبی اور تخلیقی شہرت نے انہیں ہمیشہ اہمیت دی ہے۔ ان میں مولانا محمد علی جوہر، حسرت موہانی، ابوالکلام آزاد، بہادر یار جنگ، سردار عبدالرب نشتر اور کئی اہم نام شامل ہیں۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد تک ترقی پسند تحریک کی آواز اور مقصدی آہنگ پورے برصغیر کی دھڑکنوں کی آواز اور اُس کا آہنگ بنا رہا۔

بیسویں صدی کے ابتدائی ۵۰ برسوں میں ہندوستان کے بیشتر اہلِ قلم وہی لکھنے کی کوشش کر رہے تھے، جو ہندوستان کے عوام کی خواہش اور ضرورتوں کے مطابق تھا۔ یہی سبب ہے کہ افسانہ نگار، ڈراما نویس، شاعر یا نقاد جو کچھ پیش کر دیتا، لوگ اُسے قبول بھی کرتے اور اسے اہمیت بھی دیتے۔ اس طرح اجتماعی جذبے اور اجتماعی افکار، تخلیقی فن پاروں میں اظہار پاتے رہے، لیکن پچھلی صدی کے آخری پچاس سال خصوصیت کے ساتھ پاکستان میں کچھ اس انداز سے گورے کہ عوام کی دھڑکنوں سے اور اُن کے جسم وجان کی خواہشوں سے تخلیق کاروں کا وہ سچا تعلق کٹ سا گیا، جس نے ادب اور زندگی کو ایک تسلسل میں آگے بڑھانے کے لیے راستے بنا رکھے تھے۔ غالباً ۶۰ کی دہائی میں ادب کے مرجانے کی آواز لگائی گئی اور ایسا محسوس ہوا کہ نئے عہد کی آنکھوں نے روشنیوں کے جو خواب دیکھے تھے، وہ سب پرچھائیوں میں بدل گئے ہیں۔ محمد حسن عسکری سے فیض احمد فیض تک سب ہی اپنے لمحۂ موجود سے مایوس ہوئے۔ پھر اس یاسیت کو ایک طویل تسلسل ملتا چلا گیا، جس کے درمیان ہجرت، بے گھری، اجنبیت، عداوت اور نفرت کے طاغوت زندگی کے راستوں میں ایستادہ ہونے لگے۔ اہلِ قلم نے جب عوام سے اپنے تعلق کو کم ہوتے ہوئے دیکھا تو نئے تخلیقی تجربوں کی تازگی پر سوچنے لگے، جس کے عذاب وثواب ہماری ادبی اور سماجی زندگی کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔

موجودہ سیاسی وسماجی تناظر میں اہلِ قلم وہ آواز اور اُن کا وہ اظہار جو کبھی گہرے دریا کی طرح تھا، پایاب ہوگیا اور پاکستان کے رہنے والے اہلِ قلم کو غیر اہم اور غیر ضروری چیزوں کی طرح سمجھنے لگے ہیں۔ کتاب کا چھپنا مگر نہ پڑھا جانا، ادبی جریدوں کا ڈھیرے ڈھیرے بند ہوجانا اس بات کی بڑی گواہی ہے کہ ادبی وتخلیقی تحریروں سے اور اہلِ قلم سے عوام کا رشتہ کمزور سے کمزور تر ہوتا جارہا ہے۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں لیکن اس بڑے المیے کا سب سے بڑا سبب کتاب کلچر کا ختم ہوجانا اور خواندگی میں اضافہ نہ ہونا ہے۔ ہم سب اس بڑے نقصان کے نوحہ گر ہیں اور جانتے ہیں کہ سرمایہ داروں اور وڈیرا شاہی نے کتاب کو عوام کے سیدھے اور سچے ہاتھوں سے چھین کر اپنے درباروں اور اپنے شیش محلوں میں دفن کر دیا ہے تاکہ عوامی آنکھوں میں تازہ خوابوں کے رنگ اور زندہ دھڑکنوں میں نئی خواہشیں کی خوشبوئیں پیدا نہ ہوسکیں۔

ان مشکل حالات میں اس سوال کا اٹھانا کہ قومی تناظر میں اہلِ قلم کے کردار کو دیکھا جائے، وقت کی ایسی ضرورت ہے جو اپنی پوری اہمیت کے ساتھ ہمارے درمیان موجود ہے کہ آج سے پہلے کبھی اس کی ایسی ضرورت نہیں پڑی ہوگی۔ میں ادب کے مرنے کی خبر کو مہمل سمجھتا ہوں۔ جو سچے تخلیق کاروں کو مایوس کرنے اور اُن کے حوصلوں کو پست کرنے کے لیے سرمایہ دار اور وڈیرا شاہی کا کوئی پالن ہار ہی پھیلا سکتا ہے۔ مگر میں یقین رکھتا ہوں کہ اگر ہمارے درمیان قومی تشخص کا کوئی تصور اور اجتماعی انسانی روح کی کوئی آگہی موجود ہے، تو ہر عہد کی طرح ہمارے جدید اہلِ قلم بھی نئی آنکھیں، تازہ خواہشیں اور باحوصلہ جذبوں کی تخلیق کرتے ہوئے زندگی کے بہترین معیارات تک پہنچنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔

☆☆☆

© rasailojaraid.com